© rasailojaraid.com

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL

سیر و سوانح

ابو سلمان شاہجہان پوری

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کا دینی سفر

مولانا ابوالکلام آزادؔ بہت ذہین تھے اور حسّاس بھی! ابھی صرف ۱۴، ۱۵ برس کی عمر تھی، نئی نئی اور مختلف مضامین کی کتابیں پڑھتے تھے اور اسی تیزی کے ساتھ ذہن اور خیالات پر اس کے اثرات بھی ہوتے تھے۔ اسی طرح ذہانت اور گھر پر اساتذہ کی تعلیم کا اثر ہوتا تھا۔ سوسائٹی کے نظّارے، چہل پہل، طرح طرح کے رنگ روپ پر سرسری نظر بھی، بدلتے ہوئے موسموں کی طرح چھپ کر ذہن و ذوق اور عادات پر اثر ڈالتی تھی اور گھر میں گزرتے اور بدلتے ہوئے حالات ذہن و دماغ اور جسم و جان پر اثر انداز ہوتے تھے۔ موصوف آزادؔ چونکہ ماں باپ اور بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے ہونے کے ساتھ سب سے زیادہ حسّاس بھی تھے، اس لیے گھر کے صبح و شام کے حالات سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ اگرچہ گھر کے لوگ سب سے زیادہ اُنہیں کا خیال رکھتے تھے اور سب سے زیادہ غیر مطمئن بھی وہی رہتے تھے۔

والدہ کے انتقال کے بعد اگرچہ گھر کی زندگی کے معمولات اور سونے جاگنے، اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، اسباق وغیرہ کا نظام وہی تھا لیکن گھر کی دنیا بدل گئی تھی۔ گھر کا ماحول اور زندگی کا وہ لطف نہیں رہا تھا جو بدلتے ہوئے موسموں کی طرح گھر کی زندگی کا خاصہ ہوتا تھا۔ اب گھر کی زندگی پر ایک سناٹا چھایا ہوا تھا، اور کبھی کبھی اور کسی وقت فضا میں ایک بلند آواز گونجتی تھی اور سناٹا چھا جاتا تھا۔ مولانا آزادؔ نے 'ماں سے خالی گھر' کے عنوان سے مختصر پارہ لکھا ہے، اگرچہ حالت پوری کتاب میں پھیلی ہونی چاہیے تھی اور زندگی بھر اس کا راگ ہونا چاہیے تھا، اس لیے کہ ابوالکلام کی ابھی عمر ہی کتنی تھی اور ماں کی محبت کے حظ ہی کہاں اُٹھا پائے تھے کہ وہ ماں کو بھول جاتے۔ لیکن اُنہوں نے نہایت قوتِ برداشت سے ماں کی محبت کو دل میں چھپا لیا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مضمون کا آغاز ماں کی یاد اور اس کی محبت سے نہیں، باپ کی ہیبت سے ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

”والد مرحوم کی ہیبت اُن کی شفقت پر غالب تھی۔ مجموعی طور پر ان کی زندگی چوں کہ بزرگی، عظمت اور عوام پر اثر سے مرکب تھی اور گھرماں سے خالی تھا، اس لیے قدرتی طور پر ہم لوگوں کو گھر میں بھی اُن کا وہی اثر غالب نظر آتا تھا اور قلب اس قدر مرعوب ہو گیا تھا کہ ان کی آواز سے ہم لوگ کانپا کرتے تھے۔“

والدہ کے انتقال سے پہلے گھر کے اندر جو آداب اور تہذیب پیدا ہوئی تھی، اس کا کوئی نشان باقی نہ رہا تھا۔ مولانا آزادؔ کے والدِ گرامی کے مزاج کی سختی اور دلوں پر اُن کی ہیبت ہی کیا کم تھی کہ والد کے بعض اَطوار سے سخت نالاں تھے، جن سے حضرت ولی اللّٰہی خانوادۂ علمی و دینی اور ان کے اپنے اساتذہ کے سلسلے کے علما بھی اخلاق و تہذیب کے تعلق سے بہت دور و نفور تھے۔ لیکن قدرت نے ان کے چشم و چراغ مولانا ابوالکلام آزاد جن کے ہاتھ میں قلم دیا تھا، وہ اُن سے سخت نالاں تھے۔ اُنہوں نے اپنے والد کے عقیدہ و عمل کے مشاہدے ہی پر نہیں، ان کے اخلاق و دیانت پر بھی گواہی دی ہے۔ یہ ایک عالم دین، صوفی، صاحبِ طریقت اور پیر و مرشد پر خود اُس کے بیٹے کی گواہی ہے اور مسئلہ اختلافِ دین ہی کا نہیں، جھوٹ اور فریب کا ہے۔ یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی عظمت اور استقامت و عزیمت کی شان ہے۔ یہ بیسویں صدی میں قرنِ اُولیٰ کی مثال ہے کہ بیٹے نے باپ کے خلاف صداقت و حق کی گواہی دی... اس قسم کی مثالیں مضمون کے آنے والے صفحات میں پیش کی جائیں گی۔

مولانا ابوالکلام آزادؔ ایک دین دار گھرانے اور اس کی دینی، اخلاقی، تہذیبی روایات کو زندہ رکھنے والے بزرگ تھے۔ ان کے اجداد کے بلند پایہ اخلاق اور عزیمتِ دعوت کا مقام تاریخ میں بے مثال ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد اپنے مقام، ان کے بزرگوں کے اخلاق، ان کی عزیمت اور دین کی بے پناہ محبت میں کسی طرح بھی اپنے اَسلاف سے کم تر درجہ نہیں رکھتے تھے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ابتداءً اپنے مطالعے کے ایک دور میں نہ صرف مذاہبِ عالم کی سچائی سے ناآشنا ہو گئے تھے، بلکہ اسلام کی حقیقت سے بھی گریزاں ہوئے تھے۔ لیکن خاکسار اس تذکرے کو اس زبان اور طرزِ بیان میں نہیں لکھے گا جیسا کہ عام طور پر لوگ اس قسم کے حالات اور مسائل میں استعمال کرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں خاکسار اس قسم کی زبان استعمال نہیں کر سکتا۔ خاکسار مولانا آزاد کے ردّ و قبول کو بالکل اُنھیں معانی میں استعمال کرے گا جن معنیٰ و مفہوم میں مولانا نے اُسے استعمال کیا ہو گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا ابو الکلام آزاد ایک موقع پر گمراہیٔ عمل اور تصدیق حقائق کے بارے میں لکھتے ہیں:

"گمراہیٔ عمل کی آخری حد 'فسق' ہے اور گمراہیٔ اعتقاد کی 'الحاد'۔ سو فسق و الحاد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جس سے اپنا نامۂ اعمال خالی رہا ہو، اور 'فسق' خود بھی ایک کامل قسم کا عملی الحاد ہے:

چو پُرسش گنہم روزِ حشر خواہد شد　　　تمسکاتِ گناہانِ خلق پارکنند!

قبل اس کے کہ ہم پر شہادت دی جائے، بہتر ہے کہ خود آپ ہی اپنے لیے شاہد بن جائیں: ﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا﴾ (۱۷:۱۴) اور ہم شہادت دیں یا نہ دیں، خود ہمارا وجود ہی سرتاپا شہادت ہے: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ وَّ لَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ﴾ (۷۵:۱۴،۱۵) ہاتھ پاؤں کی شہادت پر تعجب کیوں ہو، جب اس دنیا ہی میں دیکھ رہے ہیں کہ اس کا ہر لمحہ یوم الاشہاد کا حکم رکھتا ہے، اور خود ہمارا قرین بغل ہی دم بدم شہادت دے رہا ہے: ﴿لَاۤ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ وَ لَاۤ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ (۷۵:۱،۲) البتہ ساری ہلاکت اس میں ہے کہ ہنگامۂ غفلت و خود فراموشی میں نفس لوّامہ کی صدائے شہادت بہت کم کانوں تک پہنچتی ہے۔ اور پہنچتی ہے، تو خود ہمارے ہی ہاتھ سرشاری و بدمستی کے نقّاروں پر اس زور سے پڑ رہے ہیں کہ اُن کے شور و غل میں یہ سرگوشیٔ ملامت کب کام دے سکتی ہے! الّا یہ کہ ﴿صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ﴾ (۳۶:۲۹) کی گھڑی سر پر آجائے۔

گوشت از بار در گراں شدہ است　　　نشنوی نالہ و فغانِ مرا!

لیکن دنیا کی ساری سچائیوں اور یقینوں سے بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما　　　فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما![1]

اور توفیق الٰہی کے بارے میں فرماتے ہیں:

"ناگہاں جاذبۂ توفیق الٰہی پردۂ عشق مجاز میں نمودار ہوا، اور ہوس پرستی کی آوارگیوں نے خود بخود شاہراہِ عشق و محبت تک پہنچا دیا۔ آگ لگتی ہے تو رفتہ رفتہ شعلے بھڑکتے ہیں۔ سیلاب آتا ہے، تو بتدریج پھیلتا ہے۔ یہ تو ایک بجلی تھی جو آناً فاناً نمودار ہوئی، چمکی اور دیکھا تو خاک کا

۱　'تذکرہ' از ابو الکلام آزاد، البلاغ پریس، کلکتہ ایڈیشن ۱۹۱۹ء، ص ۲۹۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈھیر تھا:

می گزشتم زغم آسودہ کہ ناگہ زکمیں　　　عالم آشوب نگاہے سرِ راہم بگرفت "[۱]

"اور اس راہ کی نیرنگیوں کا کچھ عجب حال ہے۔ ہرچند، راہ ایک ہی ہے، لیکن کرشمے بے شمار ہیں۔ اور گو ہوش سب کھوتے ہیں مگر ایک ہی جلوے سے نہیں:

اے ترا با ہر دلے رازے دگر!　　　ہر گدا را بر درت نازے دگر!

کوئی پکارتا ہے اور دروازہ نہیں کھلتا۔ کوئی بھاگتا ہے اور اس پر کمند پھینکے جاتے ہیں۔ قانونِ طلب وسعی سے انکار نہیں لیکن اگر وہ بے طلب دینا چاہے، تو اس کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے؟

کارِ زلفِ تست مشک افشانی، امّا عاشقاں　　　مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند!

غرض کہ اپنی غفلت پرستیوں کا تو یہ حال تھا۔ لیکن ادھر کار فرمائے غیب کا فیصلہ کچھ دوسرا ہی ہو چکا تھا۔

بہ دَور کردنِ من از غرور می خندد　　　حریفِ سخت کمانے کہ در کمیں دارم[۲]

حضرت مولانا کے اظہار کے بعد کیا رہ گیا ہے کہ قلم کو حرکت دے... البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ حادثہ کب ہوا تھا اور طوفان کب اُٹھا تھا اور کتنی دیر کے لیے؟ مولانا نے اس طوفان کے دورانیے کے لیے ایک سال پانچ ماہ کی مدت بتائی ہے۔ فرماتے ہیں:

(ا) "الحمد للہ کہ اس منزل کے وقفہ نے بھی زیادہ طول نہ کھینچا۔ ایک سال پانچ ماہ کے اندر اس کوچے کے بھی تمام رسم و راہ ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے، کوئی گوشہ، کوئی مقام باقی نہ چھوڑا۔ نہ مجنوں سے ہم عنانی کا سودا ہے، نہ فرہاد سے مقابلے کا دعویٰ۔ نہ یہ کہ

شمہ از داستانِ عشق شور انگیز ماست　　　ایں حکایتہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند

البتہ یہ ضرور ہے کہ عشق و عاشقی و طریق آشفتگی و جاں سپاری کی جتنی باتیں سننے میں آتیں، وہ سب کر کے دیکھ لیں، اور اس راہ کا کوئی حال و معاملہ ایسا نہیں رہا جو کسی زبان پر ہوا اور اپنے اوپر نہ گزر چکا ہو:

۱　تذکرہ، ص ۲۹۵

۲　ایضاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کچھ قمریوں کو یاد ہیں، کچھ بلبلوں کو حفظ عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں![1]

اگرچہ اس معاملہ کا خاتمہ بظاہر ناکامی و مایوسی پر ہوا۔ لیکن فی الحقیقت فتح و مراد کی ساری شادمانی اسی ناکامی میں پوشیدہ تھی۔ اسی ناکامی نے بالآخر کامیابی کی راہ کھولی، اسی مایوسی سے اُمید کا دروازہ کھلا۔ جو تاریکی اپنی سیہ بختیوں کی رات نظر آتی تھی، وہی صبح مقصود کے طلعت جہانتاب کا نقاب ثابت ہوئی۔ گو قدم بت کدہ کی راہ پر تھے، مگر غبارِ مجاز دور ہوا، تو کعبۂ حقیقت سامنے تھا: ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ يُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ كَذٰلِكَ تُخْرَجُونَ ﴿١٩﴾﴾ (۳۰:۱۹)

کفر آوردم و در عشق تو ایماں بُردم

سارا کام پہلے سے ہو چکا تھا۔ جو لھا مدتوں سے گرم تھا، ہوس بازی نے چنگاریوں کا کام دیا، عشق نے شعلے بھڑکائے تھے۔ صرف اتنی بات باقی رہ گئی تھی کہ ایک دیگ اُتار کر دوسری چڑھا دی جائے۔ یہ کام عشق کی اُمیدوں سے نہ ہو سکا، تو کیا مضائقہ! عشق کی مایوسیوں نے تو پورا کر دیا:

آں نافۂ مراد کہ می خواستم ز غیب در چینِ زلفِ آں بتِ مشکیں کلالہ بود[2]

(۲) "اگر کسی کو اوّل روز سے اپنے زہد و پاکی کی خشک دامنی پر ناز ہو، تو ہم کو بھی اپنی اُس رندی و ہوس ناکی کی تردامنی کا کوئی شکوہ نہیں، جس کو عین اکیس بائیس کی عمر میں (کہ جنونِ شباب کی سرمستیوں کا اصلی موسم ہوتا ہے) دونوں ہاتھوں سے اس طرح نچوڑا کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑا۔

(۳) اس واقعے کے عہد کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں:

"باوجودیکہ اس معاملہ پر کامل نو برس گزر چکے ہیں لیکن الحمد للہ کہ جو درد پہلے داغ اور پھر زخم بن کر رہا تھا، اب ناسور بن کر نہاں خانۂ دل میں محفوظ ہے، اور اُمید ہے کہ ہمیشہ محفوظ رہے گا۔"[3]

---

۱ تذکرہ، کلکتہ ایڈیشن، ۱۹۱۹ء، ص ۳۰۰

۲ ایضاً، ص ۳۰۱و۳۰۲

۳ ایضاً، ص ۳۰۹و۳۱۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الف) اس میں مدتِ حادثہ کو خود حضرت مولانا نے بیان کر دیا ہے کہ اوّل تا آخر حادثے کے تمام اثرات ایک سال ۵ ماہ میں پیدا ہوئے اور مٹ چکے تھے۔

ب) اس میں پیش آنے والے واقعے کو اس وقت تک جب کہ وہ رانچی کی نظر بندی (اپریل ۱۹۱۶ء تا ۳۰ دسمبر ۱۹۱۹ء) میں تھے اور تذکرہ کی تالیف (۱۹۱۸ء) میں مصروف تھے، پورے نو سال گزر چکے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ دور ۱۹۰۸ء میں ختم ہو چکا تھا اور اس کا دورانیہ ایک سال پانچ ماہ کے شب و روز پر محیط تھا۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ کب پیش آیا، کس مدت تک گم راہی کی حالت رہی، کب اس سے نجات پائی اور کب حق و صداقت کی زندگی کے شب و روز ایک کامل درجے کے مسلمان کے معمولات کے مطابق گزرنے لگے!

مولانا آزاد نے اپنی زندگی کے اس حیرت انگیز واقعے کا تذکرہ سب سے پہلے ۱۹۲۱ء میں اس وقت کیا جب کہ وہ رانچی میں بہ زمانۂ اسارت 'تذکرہ' لکھ رہے تھے۔ مولانا کی یہ تحریر فارسی زبان میں ڈوبی ہوئی اُردو میں ہے۔ زبان کی بلندی، روانی اور لطافت میں کوئی شبہ نہیں لیکن اس مسئلے کی زبان میں شاید مولانا نے ارادتاً کچھ مشکل اُسلوب اختیار کیا ہے اور حقائق کو آشکارا کرنے کے بجائے ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کوشش کے باوجود وہ اسی سعی میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ کسی نہ کسی جگہ حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹ ہی جاتا ہے اور حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے۔ لیکن تذکرہ کی اشاعت کے چالیس سال کے بعد، حضرت مولانا کے ۱۹۵۸ء میں انتقال کے بعد، مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی نے 'آزاد کی کہانی' شائع کی۔ یہ چوں کہ عام بول چال کی زبان میں تھی، اس لیے اس کی سادگی نے حقائق کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ اب کوئی بات نہ راز میں رہی اور نہ کسی درجے میں چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مولانا نے خود ہی گھر کے حالات اور حضرت والد گرامی مولانا خیر الدین کے حالات خود ہی پوست کندہ کر دیے ہیں۔

------------۲----- ------

مولانا آزاد کی زندگی کے ابتدائی حالات اور ان کے شوق و مذاق کی سب باتیں مثلاً تصنیف، تالیف، شاعری، اخبار و رسائل کے اجرا و مباحث، تقاریر، مطالعہ و مشاہدے کا شوق وغیرہ، یہ مشاغل تو ان کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پسند کی باتیں تھیں۔ گھر کے اندرونی حالات، والد مرحوم کی سخت گیری اور بہن کی شادی کا مسئلہ، جو والدہ کی زندگی میں ماموں کے بیٹے سے ہونے والی تھی، لیکن والدہ کے انتقال کے بعد جب وہ مکہ مکرمہ سے کلکتہ پہنچا تو والد مرحوم نے اس طے شدہ اور پسندیدہ رشتے سے انکار کر دیا اور ان کی اولاد کا اس کے خلاف خاموش ردّعمل کا اظہار کچھ کم تھا؟ لیکن اُنھوں نے اس بات کو محسوس ہی نہ کیا کہ ان کی منگیتر بیٹی جو اس رشتے سے خوش تھی، اس کے دل پر، اور ان کی دوسری بیٹیوں اور بیٹوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی!

حال آں کہ قطعاً اُمید تھی کہ اگر والد محترم اپنی ضد سے باز آجائیں تو وقت گزرنے کے ساتھ ان کی رنجش دور ہو جاتی اور ایک اچھے اور مثالی خاندان کی بنیاد پڑتی! لیکن کوئی عالم دین جو حقائق دینی سے واقف ہو، احکام کتاب و سنت جس کے سامنے کھلے ہوئے ہوں اور ان کی تاثیر و فیضان سے محروم بھی ہو تو ایک عام شخص اس کے بارے میں سکوت اختیار کرنے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے کہ قدرت نے خود اس کے نونہال کو اس کی حقیقت دینی سے پردہ ہٹا دینے پر متوجہ کر دیا ہو!

اب قارئین غور فرمائیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد جب کہ وہ ۱۴، ۱۵ برس کے بچے ہی تھے، ان کے والد گرامی اپنے حسین اور ذہین بیٹے کو کیا سکھا رہے تھے، کیا پڑھاتے تھے، اسے کس راہ پر ڈال رہے تھے اور کیا بنا رہے تھے؟ مولانا آزاد اپنے والدِ گرامی مرحوم کے بارے میں فرماتے ہیں:

"حقیقتاً میں سوچتا ہوں، تو اس بارے میں والد مرحوم کا تعصّب، حد درجے تک پہنچا ہوا تھا، اور میں حیران ہوں کہ اسے کیوں کر کسی لفظ و جملے میں محدود کروں۔ یہ پہلے بہ تفصیل کہہ چکا ہوں کہ کس طرح اوائل عمر سے یہ عصبیت ان میں جاں گزیں ہوئی اور کس طرح مدت العمر ان کی تمام تصنیف و تالیف، وعظ و مباحث کا تنہا مرکز و مطمح رہی ہے۔ مجھے اپنے بچپن کی پرانی سے پرانی مسموعات جو یاد آتی ہیں، ان میں 'وہابیت' کا ذکر موجود پاتا ہوں۔"

"شب و روز اس کا چرچا گھر میں بھی رہتا تھا اور باہر بھی۔ والد مرحوم کے جو خدام اور مرید تھے، وہ بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور یہ قدرتی تھا۔"[1]

---

۱ 'آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی' بہ روایت ملیح آبادی، دہلی، حالی پبلیک ہاؤس، اپریل ۱۹۵۸ء اوّل: ۳۶۱، ۳۶۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا ابو الکلام آزاد کو بچپن ہی سے جو تعلیم دی جاتی تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا خیر الدین مرحوم کے ایک مریدِ خاص و خدمت گزار حافظ ولی اللہ جو اُنہیں کبھی کبھی گھر سے باہر پھرانے کے لیے لے جاتے تھے، اسی تعلق سے مولانا آزاد نے 'غبارِ خاطر' میں ان کا ذکر کیا ہے اور 'آزاد کی کہانی' میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ان کو کیا سکھایا کرتے تھے، مولانا آزاد فرماتے ہیں:

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں میرا تخیل یہ تھا کہ وہابی کوئی خاص طرح کا ایک بڑا ہی مکروہ اور قابل نفرت مخلوق ہے! میں اپنے ذہن میں اس کا تصور یوں کرتا تھا کہ ایک قبیح صورت انسان جس کا آدھا چہرہ کالا ہے اور پیشانی پر بہت بڑا گھٹا ہے، یہ اس لیے کہ حافظ صاحب کی زبانی سنتے تھے کہ دل کے کفر اور بغضِ رسول ﷺ کی وجہ سے وہابیوں کا آدھا منہ کالا ہو جاتا ہے اور ان کی علامت یہ ہے کہ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے پیشانی پر ایک بہت بڑا گھٹا بنا لیتے ہیں!"[1]

یہ تعلیم کسی بڑی بوڑھی کی چڑیا چڑے کی کہانی نہیں جو وہ بچوں کو سنا کر سُلاتی ہیں، بلکہ وقت کے پیرو مرشد کی تعلیم ہے۔ جو پہلے خدام و مریدین کے ذہنوں اور دلوں میں اُتارتے ہیں پھر وہ عوام میں پھیلا کر پیر صاحب کے فضائل و کمالات سنا سنا کر اُن کے نام اور شہرت کو پھیلاتے ہیں۔ مولانا آزاد نے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ اُن کے گھر سے باہر تک یہی ہنگامہ برپا تھا۔ مولانا کے الفاظ یہ ہیں کہ "والد مرحوم کے جو خدام اور مرید تھے، وہ بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔"

مولانا خیر الدین مرحوم نے اپنے خدام اور مریدین کو اسی رنگ میں رنگ لیا تھا۔ ان میں سے حافظ ولی اللہ اُن کے مریدِ خاص مولانا ابو الکلام آزاد کو اسی رنگ میں رنگنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ وہابیوں کی رسوائی کا ایک طریقہ یہ اختیار کیا گیا تھا کہ اُن کے ناموں کے لیے مکروہ اور خبیث چیزوں، مچھروں اور چوہوں سے تکلیف و نقصان وغیرہ کے لیے یا کسی کانے اور بد شکل آدمی کے لیے متبادل نام 'وہابی یا وہابیوں' اسماء کو استعمال کیا جاتا تھا۔ مولانا نے اشارات ہی میں اس شکل کا ذکر ہی نہیں کیا بلکہ تحریر میں بھی اس کی شکل پیش کر دی ہے۔ مولانا کہتے ہیں:

---

۱ ایضاً: ص ۳۶۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

”ہمارے دیوان خانے میں اس بارے میں خاص مصطلحات اور اسماء تھے، دنیا کی ہر مکروہ اور خبیث چیز اسی لقب سے پکاری جاتی تھی۔ مثلاً حافظ جی کہتے تھے:”شب کو اس قدر وہابی تھے کہ نیند نہ آئی۔“یعنی مچھر بہت تھے۔”دیوان خانے میں کتابوں کے صندوق پڑے تھے، ان کے نیچے 'وہابی' چلے جاتے تھے اور پیندے میں سوراخ کر دیتے تھے۔“یعنی چوہے!... چنانچہ بڑی جدوجہد کے ساتھ 'وہابیوں' کو پکڑا جاتا تھا اور ہم لوگ یوں حساب کرتے تھے:” آج دو وہابی مارے گئے! ایک بہت بڑا وہابی بھاگ گیا۔

نہیں معلوم کون غریب تھا لیکن ایک بڑا ہی بدصورت آدمی تھا۔ ایک آنکھ سے کانا، دوسری میں بھی جالا، چہرے پر شاید فالج بھی گرا تھا، ایک طرف سے لب ٹیڑھے تھے، رنگ بالکل سیاہ۔ رستے میں کبھی کبھی ہم حافظ صاحب کے ساتھ سڑک پر جاتے، تو اس غریب کی طرف اشارہ کر کے وہ کہتے:”دیکھو، وہ خبیث وہابی کھڑا ہے۔“ مجھ پر اس کی خوف ناک صورت کا واقعی بڑا ہی دہشت انگیز اثر پڑتا، مجھے یاد ہے کہ کئی مرتبہ میں نے نیند میں ایسے ہی خوف ناک 'وہابی' کو دیکھا اور ڈر کے رونے لگا!“ [۱]

مولانا ابوالکلام آزاد کے بچپن ہی سے اُن کے سامنے حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ایسی باتیں کی جاتی تھیں، جس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے والدِ گرامی حضرت شاہ صاحب کے لیے اپنے بیٹے کے قلب میں غلط فہمی پیدا کرنا چاہتے تھے!... اور اگر وہ ایسا نہیں چاہتے تھے تو یہ نیکی کا کون سا عمل تھا جو انجام دیا جاتا تھا؟

مولانا آزاد اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ بچپن کے دور سے ابھی قدم بھی نہ نکلا تھا، اس وقت اُنھوں نے حضرت شاہ صاحب کے مقام کو بھی نہ سمجھا تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ جب ان کو حضرت شاہ اسماعیل شہید سے واقفیت ہوئی، حضرت کے مقام کو سمجھا تو اُن کے عقیدت مند ہوئے اور والدِ گرامی کی صداقت اور امانت و شرافت کا بھانڈا پھوٹا تو والد صاحب سے بدظنی انتہا کو پہنچی اور حضرت شاہ صاحب کی سربلندی کا یہ عالم ہوا کہ ایک خاص مسئلے میں اپنے دادا حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ

---

۱ ایضاً ص ۳۶۱، ۳۶۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی بزرگی اور عظمت پر بھی سبقت لے گئے۔[۱] قدرت نے ان کے سعید و صالح بیٹے کے ہاتھ سے باپ کے چہرے سے ان کی حقیقت کا پردہ ہٹا دیا۔ کتنی حیرت انگیز بات کہ باپ جس بیٹے کو ایک غلط راستے پر ڈالنا چاہتے تھے، دنیا میں اس نے عزت و شہرت پائی، برّعظیم ہند و پاک میں اس کے نام دین وسیاست اور ملک و قوم وملت کی خدمت کے ڈنکے بج گئے اور باپ کی گم شدگی کا یہ عالم ہے کہ اس پیرو مرشد اور صوفی صفت کا اس کے وطن میں بھی کوئی عقیدت مند موجود نہیں اور دین داروں اور خدا پرستوں کی تاریخ میں ان کی شخصیت کا ذکر اور دینی خدمات کا سراغ نہیں ملتا! لیکن ان کے سعید و صالح اور حق پرست بیٹے ابوالکلام آزاد ہی کے قلم اور زبان سے سن لیجیے۔

یہ داستان اس دور کی ہے جب وہ اپنی تعلیم کے وسط تک بھی نہ پہنچے تھے اور ابھی جوانی کی حد کو بھی نہ چھو سکے تھے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں، مطالعہ فرمائیے:

> ”ہم ابھی بہت ہی چھوٹے تھے، اتنے کہ اُردو کی مبادیات پڑھتے تھے، لیکن مولوی اسماعیل، سید احمد بریلوی، 'تفویۃ الایمان' (تقویۃ الایمان) وغیرہ کے ناموں سے خوب واقف ہو گئے تھے، کیونکہ ہمیشہ سامنے آتے تھے۔ سیکڑوں مرتبہ ہمارے سامنے والد مرحوم ان لوگوں کے حالات بیان کرتے اور ہم سن سن کر اچھی طرح شناسا ہو گئے تھے۔ تقویۃ الایمان کو وہ تقریر و تحریر میں 'تفویۃ الایمان' کہتے تھے۔ ان کا جو نسخہ ہے، اُس کی لوح پر انھوں نے چاقو سے ایک ایک نقطہ چھیل دیا۔ وہ یہ لطیفہ بھی بطورِ اولیاء اللہ کی کرامت کے بیان کرتے تھے کہ جب مولوی اسماعیل نے 'تقویۃ الایمان' لکھی تو خود ان کے مسودے میں کتاب کے نام

---

۱ حضرت شاہ اسماعیل شہید کے متعلق یہ اشارہ 'تذکرہ' میں 'مقام عزیمتِ دعوت' کے سلسلے میں آیا ہے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں: ”پھر چند قدم اور آگے بڑھو، مقام عزیمتِ دعوت کی کیسی کامل اور آشکارا مثال سامنے آتی ہے۔ ساری مثالوں سے آنکھیں بند کر لو، صرف یہی ایک مثال زیر بحث حقیقت کے فہم و کشف کے لیے کافی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام ہر رنگ میں کس درجہ جامع و کامل ہے؟ بااین ہمہ یہاں جو کچھ ہوا، تجدید و تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیتِ اصحابِ استعداد تک محدود رہا، اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ فعلاً عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع کا پورا کام تو کسی دوسرے ہی مردِ میدان کا منتظر تھا۔ اور معلوم ہے کہ توفیق الٰہی نے یہ معاملہ صرف حضرت علامہ مجدد شہید کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ خود حضرت شاہ صاحب کا بھی اس میں حصہ نہ تھا:

می خواست رست خیز زعالم بر آورد — آں باغبان کہ تربیت ایں نہال کرد!

اگر خود شاہ صاحب بھی اس وقت ہوتے تو انہی کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔

('تذکرہ' مولانا آزاد، کلکتہ، البلاغ پریس ۱۹۱۹ء: ۲۴۵، ۲۴۶)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ایک نقطہ رہ گیا تھا۔"[1]

قارئین کرام! انڈرلائن سطور کو کچھ ملاحظہ فرمائیں، ان میں باپ بیٹا دو کردار ہیں۔ بیٹا کہتا ہے کہ میرے باپ نے کتاب کے نام 'تقویۃ الایمان' میں ق کو چاقو سے کھرچ کر 'تعویۃ الایمان' بنایا ہے۔ باپ کہتا ہے کہ یہ اولیاء اللہ کی کرامت ہے، شاید اس طرح کہ ان اولیاء اللہ نے حضرت شاہ صاحب کے ذہن و دماغ پر ایسا چھپٹا مارا ہوگا کہ ذہن ماؤف ہوگیا اور ایسا کہ انھی سے کتاب کا نام بدلوا کر انھی کے ہاتھ میں ایک نسخہ پکڑا دیا ہوگا۔ خدا معاف کرے! ان کا فراڈ، جھوٹ، گمراہی، دھوکا، وغیرہ، ایک ہی سر پر کتنے گناہ تھپے ہوں گے اور موت کے بعد کن حالات میں ان کی آخرت گزر رہی ہو گی... إنا لله وإنا إليه راجعون!

پچھلی کہانی مولانا آزاد کی کم عمری کی کہانی تھی۔ اب جب کہ مولانا کی عمر اور مطالعہ و بصیرت میں زیادہ بلندی ہوگئی ہے، اپنا مشاہدہ اور آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کے لیے زیادہ عبرت انگیز ثابت ہوگا۔ مولانا فرماتے ہیں:

> "جب ذرا اور بڑے ہوئے، تو والد مرحوم کے وعظ اور گھر کی باتوں کو بھی خوب سمجھنے لگے۔ ہمیشہ وہابیوں کے عقائد کا رد رہتا تھا، کوئی بات کہی جائے، وہ فوراً یاد آجاتے تھے۔ گریز یوں ہوتا تھا کہ "مگر وہابی یوں کہتے ہیں" پھر ان کا رد کیا جاتا تھا۔ رد ایسے الفاظ پر مشتمل ہوتا تھا، جس کے صاف معنی ان پر تلعّن اور ان کی تکفیر کے تھے۔ ہم نے سینکڑوں مرتبہ والد مرحوم سے سنا کہ "ان کا کفر یہود و نصاریٰ کے کفر سے بھی اَشد ہے۔ یہود و نصاریٰ بھی اپنے پیشواؤں کے منکر نہیں ہیں، یہ خبیث تو خود اپنے پیغمبر کے منکر ہیں!"[2]

مولانا ابوالکلام آزاد آپنے بچپن سے بہت ذہین تھے۔ درس کے دوران وہ اپنے محترم اساتذہ کو بہت سوالات سے نہ صرف حیرت میں ڈال دیتے بلکہ لاجواب کر دیتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی مولوی غلام یاسین عمر میں ان سے دو سال بڑے تھے لیکن تعلیم میں ان کے ساتھ اور ذہانت میں اُن سے کم! مولانا روز اپنے کسی اُستاد کو کسی مسئلے میں اُلجھا کر پریشان کر دیتے تھے، ان کے بھائی نے اس طرح کبھی

۱ ایضاً: ص ۳۶۴۔۳۶۲

۲ ایضاً: ص ۳۶۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے استاد کو پریشان نہیں کیا۔

مولانا کے والد گرامی مولانا خیر الدین احمد کبھی کبھی اپنے بیٹوں کی تعلیم کے معیار و رفتار وغیرہ کے معائنے کے لیے اُنھیں اپنے پاس بلا لیتے تھے اور کوئی سبق شروع کر دیتے تھے۔ مولانا آزاد والد گرامی کے درس میں بھی کوئی سوال یا اعتراض کر دیتے اور بحث چھڑ جاتی تھی۔ اور اس کا ایک نتیجہ سامنے آجاتا تھا۔ مولانا خود فرماتے ہیں:

"خود والد مرحوم نے، مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ بیضاوی پڑھاتے ہوئے ضمناً قرأۃ فاتحہ کی بحث چھیڑی اور ایک بہت مفصل تقریر کی۔ زیادہ تر وہی نظریے اور دلائل تھے۔ روایت کی بنا پر بڑا زور وہی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مشہور روایت پر تھا کہ «إقرأ بها في نفسك» اور في نفسك سے استدلال یہ کیا جاتا تھا کہ قراءۃ باللفظ والصوت سے منع کیا اور قراءتِ نفسی کا حکم دیا۔ پھر قرأتِ نفسی کے یہ معنیٰ کیے جاتے تھے کہ نفس کا تخیل و تصور۔"

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت بھی میرا ذہن یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ صدرِ اوّل کی زبان فلسفہ و منطق کی زبان نہ تھی۔ میں نے معترضین کی طرف منسوب کر کے عرض کیا کہ کہا جائے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا یہ مطلب کہاں ہے؟ عربی میں نَفس کا اطلاق ایسے موقعوں پر تو ذاتِ خاص پر ہوتا ہے، جیسے: 'خود آپ' یا فارسی میں کہتے ہیں: 'خود'، چنانچہ نفسه و اَنفسکم وغیرہ کا مطلب، فلسفے کا مصطلح نفس نہ ہوگا، بلکہ یہی ہوگا کہ 'اُس کی ذات اور تمھارے ذوات'، مثلاً کہیں گے: جاء بنفسه تو یہ مطلب تو نہ ہوگا، جو اس حدیث میں بتلایا جاتا ہے۔ پس اقرأ في نفسك تو معترضین کے لیے مفید ہے، نہ کہ قائلین کے لیے، اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ في نفسك یعنی اپنے اندر پڑھ لے۔ مقصود یہ تھا کہ پکار کر نہیں پڑھنا چاہیے، بلکہ اس طرح آہستہ آہستہ پڑھنا جیسے آدمی اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔

والد مرحوم ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھنے لگے! اس لیے کہ جہاں تک میرا خیال ہے، یہ بالکل نیا اعتراض تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اب خود دیکھا تو معلوم ہوا کہ اتنی صاف اور قطعی بات، فریق ثانی کی کسی کتاب میں بھی موجود نہیں ہے، البتہ مولوی عبدالحی مرحوم نے آہستہ پڑھنے پر اس سے استدلال ضرور کیا ہے، مگر پھر بھی یہ اعتراض نہیں کیا، حالانکہ وثوق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ عربی زبان میں قطعاً وہ معنی نہیں ہو سکتے، جو ابن ہمام وغیرہ کہتے ہیں۔ والد مرحوم نے کہا کہ اپنے آپ سے کہنے کا مطلب کیا ہوا؟ یہی مطلب ہوا کہ اپنے ذہن میں تصور کرے۔ میں نے کہا: تصور کا تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے، صرف اقرأ موجود ہے اور اعتراض یہ ہوگا کہ قراءتِ صوتی اور قراءتِ نفسی کی جو تقسیم اب کی جاتی ہے، یہ اس وقت کہاں تھی؟ مگر اس پر انھوں نے توجہ نہ کی، اور اسی پر زور دیتے رہے کہ مقصود یہ ہے کہ ویسی قراءت نہ کی جائے، جیسی آہستہ یا پکار کے کی جاتی ہے، اور وہ تیسری چیز یہی ہے، جو ہم کہتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ اعتراض رفع نہ ہوا، لیکن میں زیادہ اصرار بھی نہیں کر سکتا تھا۔"[1]

اسی قسم کا ایک اور واقعہ بھی انھی دنوں باپ بیٹے کے درمیان پیش آیا تھا۔ قصہ یہ تھا کہ ایک شخص کو مولانا کے دیوان خانے میں پکڑ کر لایا گیا تھا۔ مولانا آزاد کو گھر میں ہنگامے کی آواز آئی، جھانک کر دیکھا تو ایک شخص صاحبِ ریش و دستار حضرت والد کے غیظ و غضب کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ والد کا ایک مرید سامنے تھا۔ پوچھا: یہ کون شخص ہے؟ اس نے بتایا: یہ وہابی ہے، مولانا آزاد حیران ہوئے کہ یہ کیسا وہابی ہے؟ اس کی تواضع کر کے دھکے دے کر نکال دیا گیا۔ مولانا آزاد گھر میں منتظر تھے کہ والد گرامی سے کچھ پوچھوں! جوں ہی والد مرحوم نے آنگن میں قدم رکھا، مولانا نے فوراً سوال کر دیا۔ بیٹے باپ میں کیا سوال جواب ہوئے اور کیا نتیجہ نکلا۔ یہ ہمارے مولانا کی زبان سے سنیے، فرماتے ہیں:

"ایک دن مجھے یاد ہے، جمعے کے دن وعظ سے آ کے والد مرحوم، حسبِ معمول دیوان خانے میں بیٹھے تھے۔ قاعدہ تھا کہ وعظ کے بعد آدھ گھنٹے وہاں بیٹھ کے پھر زنان خانے میں آتے تھے۔ زور زور سے باتوں کی آواز آنے لگی۔ میں دوڑا ہوا گیا، ایک شخص پگڑی باندھے، بڑی داڑھی، دوزانو بیٹھا، بڑے ادب سے باتیں کر رہا تھا، لیکن والد مرحوم اس پر گرج رہے تھے، اور تمام لوگ اس طرح خون ریز نظروں سے اسے گھور رہے تھے کہ آنکھوں میں اس کا خون پی جانا چاہتے ہیں۔ اس نے خطرہ محسوس کر لیا تھا، اسی لیے ڈرتا اور کانپتا بھی جاتا تھا۔ دروازے کے قریب فضل کریم ایک پنجابی مرید بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا: کون ہے؟ انھوں نے کہا، وہابی ہے! اب میں بڑے تعجب سے دیکھنے لگا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ آدھا

1 'آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی' بہ روایت ملیح آبادی، دہلی، حالی پبلی ہاؤس، اپریل ۱۹۵۸ء اوّل: ص ۳۷۷-۳۷۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منہ کالا نہیں ہے۔ لب بھی ٹیڑھے نہیں، آنکھیں بھی دونوں ہیں۔ چہرہ بھیانک بھی نہیں ہے۔ معاملہ میری نظر میں اتنا اہم اور سنجیدہ تھا کہ جوں ہی والد اپنے کمرے میں آکر بیٹھے، میں نے کہا: یہ وہابی تھا؟ انھوں نے کہا: ہاں! میں نے کہا مگر اس کا چہرہ تو کالا نہیں تھا! انھوں نے کہا: ہاں! یہ کالک ایک ہی مرتبہ میں نہیں آجاتی۔ جب کبھی آدمی بگڑتا ہے تو دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ پھر جب وہ بگڑ جاتا ہے تو دوسرا نقطہ لگتا ہے، یہاں تک کہ پورا دل کالے نقطوں سے بھر جاتا ہے، پھر بھی اگر وہ باز نہ آئے تو تمام نقطے مل جاتے ہیں اور دل کالا ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کالک منہ پر آجاتا ہے۔ ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ...﴾[1] اب تک یہ پوری بات اُن کی یاد ہے۔“

------------۳----- ------

بیٹے کی ذہانت سے دہریت کا خطرہ

مولانا ابو الکلام ابھی تعلیم سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کی ذہانت، حسنِ کلام اور کمالِ بحث کی شہرت ان کے اساتذۂ محترم سے اور مسجد میں کلکتہ اور بیرونِ شہر سے ملاقات کے لیے آنے والوں سے اُن کی قابلیت اور ذہانت کی شہرت پھیل رہی تھی اور مولوی غلام یاسین آہ کے ذریعے شہر میں ہونے والے بحث و مباحثے اور ہنگاموں اور مولانا آزاد کی پھیلتی ہوئی شہرت کی خبریں والد صاحب تک بھی پہنچ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی والد گرامی کے دل میں خطرات کا اضافہ بڑھتا جارہا تھا، چوں کہ حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی کے ایک شاگرد مولوی عبد الرحیم گورکھ پوری کے بارے میں شہرت تھی کہ وہ اپنی ذہانت اور قابلیت کی بدولت ہی گمراہی اور دہریت کا شکار ہو گئے تھے۔ اگرچہ مولانا آزاد ان کی دہریت کے قائل نہیں تھے، لیکن والد کا خیال دوسرا تھا اور اپنے بیٹے کی ذہانت سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔ مولانا خود اپنے بیان میں فرماتے ہیں؟

”بھائی مرحوم کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میرے خیالات میں وہابیت کی طرف میلان پیدا ہو چکا

---

۱ ترجمہ: ”دراصل ان لوگوں کے دلوں پر ان کے بُرے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔“

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے، وہ اس پر بگڑتے بھی تھے اور ایک دو بار والد مرحوم کے سامنے بھی انھوں نے اس کا اشارہ کر دیا تھا۔ اس وقت تک والد مرحوم کو میرے عقائد و خیالات کی بابت یقین کے ساتھ کوئی بدگمانی نہیں ہوئی تھی، مگر اس خیال کی بنیاد پڑ چکی تھی کہ اس کی طبیعت ہر طرف دوڑنے لگی ہے، اور خیالات محفوظ نہیں ہیں۔ کئی بار انھوں نے فرمایا بھی تھا: ”مجھے اس کے آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ بہت زیادہ ذہانت، انسان کے لیے بسا اوقات گمراہی کا ذریعہ ہو جاتی ہے۔ میں اس کی ذہانت سے ڈرتا ہوں!“

پھر بعض اشخاص کے حالات سناتے تھے جو ذہانت و طباعی کی وجہ سے ہر طرف خیال دوڑانے لگے اور بالآخر دین و دنیا سے کھو گئے۔ مجھے یاد ہے، اسی سلسلے میں ایک دن مولوی عبدالرحیم گورکھ پوری کے حالات سنائے۔ یہ شاہ عبدالعزیز مرحوم کے بڑے پرانے شاگرد تھے اور والد مرحوم کہتے تھے کہ نانا مرحوم جب شاہ صاحب سے پڑھنا ختم کر چکے تھے، تو یہ نئے نئے درس میں شریک ہوئے تھے، لیکن اس وقت بھی ان کی ذہانت و طباعی کا یہ حال تھا کہ شاہ صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں جو اس وقت علمی جماعتوں کا خلاصہ و عطر تھا، کوئی شخص ان کی ٹکر کا نہ تھا۔ معقولات کے حافظ تھے اور ہنگام درس ایسے ایسے اعتراضات اور ایسے ایسے نکتے اور پہلو تراشتے تھے کہ شاہ صاحب کو بھی اعتراف کرنا پڑتا تھا۔

یہ حال دیکھ کر شاہ صاحب کہا کرتے تھے: مجھے تمہاری ذہانت اور طباعی کے پیچھے دہریت کھڑی نظر آتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، دلی سے کلکتہ آئے اور یہاں انگریزوں کی نوکری کر لی۔ پھر ان کی زبان اور علوم کا شوق ہوا، اور چند دنوں کے بعد کھلم کھلا ملحد و دہری ہو گئے۔ خدا کے وجود پر ایک سو سترہ اعتراضات ایسے کیے تھے جن کی نسبت دعویٰ تھا کہ تمام دنیا کے عقلا بھی اکٹھے ہو جائیں تو بھی جواب نہیں دے سکتے غرضیکہ ذہانت و دانش مندی، موجبِ ہلاکت ہوئی اور سرے سے ایمان و یقین ہی کھو بیٹھے!“[1]

1 ’آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی‘: ص ۸۸- ۳۸۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سر سید کی تقلید اور قلب کی ہلاکت خیزی

مولانا آزاد کو کتابوں کے مطالعے کا چسکا شروع سے گھر کر گیا تھا اور یہ بات قابل تعریف تھی کہ ابتدا ہی سے ان کی نظر بلند پایہ اور ذوق اعلیٰ تھا۔ اس سلسلے میں سر سید احمد خان اُن کے سب سے بلند پایہ محبوب شخصیت تھے۔ وہ انھیں مجتہد فی المذاہب سمجھتے تھے اور ایک وقت وہ اُن کے مجتہدات کو مرتب کرنا چاہتے تھے۔ وہ برّ عظیم پاک و ہند میں انھیں سب سے بڑی شخصیت سمجھتے تھے۔ ان کی تصنیفات اور افکار سے عالم اسلامی کو متعارف کرانا چاہتے تھے لیکن ایک دو سال کے مطالعہ و تقلید سے کیا نکلا؟ مولانا کی زبان سے سنیے کہ اب وہ کس مقام پر ہیں، کیا سوچ رہے ہیں؟ فرماتے ہیں:

اطمینانِ قلب ہلاک ہو گیا: ”میرا اطمینان یکسر ہلاک ہو گیا اور زندگی روز بروز ایک لا علاج مرض کی شکل میں مبدل ہوتی گئی۔ ایک عام اور دائمی مصیبت، جو اس راہ میں پیش آتی ہے اور ہمیشہ پیش آتی ہے، یہ ہے کہ اس حالت کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کاوش و جستجو، مزید غور و تفکر اور مطالعہ و نظر کے سوا اور کوئی علاج نظر نہیں آتا۔ جوں جوں شکوک بڑھتے ہیں، سوالات اُمنڈتے ہیں، طبیعت اور زیادہ نظر و تفحص میں مبتلا ہوتی ہے، اور دماغ کا عمل ایک بے رحم تیزی کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے اور فی الحقیقت اسی حالت سے اور زیادہ تشنگی اور ہلاکت بڑھتی ہے گویا نسخہ، مرض کی نئی نئی ترقیوں کا موجب بن جاتا ہے۔ یہی حالت مجھے پیش آئی اور میں ہمہ تن داغ ہو گیا۔“

پچھلے ایک سالہ دور میں عملی زندگی نہایت ضعیف پڑ چکی تھی۔ تھوڑا بہت تسمہ جو لگا رہا تھا، وہ بھی اب کٹ گیا۔ سر سید کے مسلک کا سب سے پہلا اثر اعمال ہی پر پڑا تھا۔ جب اس بات کا استغراق بڑھ گیا کہ تمام واجبات و فرائض شرعیہ ان ان مصالح اور حکمتوں پر مبنی ہیں اور مقصود صرف ان ان فوائد کا حصول ہے تو پھر ظاہر ہے کہ طبیعت میں ادائے فرض کا کوئی جذبہ باقی نہیں رہتا۔

مولانا ابو الکلام اپنی تعلیم کے آغاز ہی سے افکار و عقائد کے جس آزار میں مبتلا ہوئے تھے، ابھی اس کی درستگی اور انتہا کا کچھ پتا نہ تھا۔ باپ، بھائی اور تین بیٹوں کے درمیان زندگی کا انداز تھا، اسی طرح گزر رہی تھی لیکن جو بے چینی تھی ایک روایتی خاندان میں، وہ بھی ہر کسی کے لیے ناقابل برداشت نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی۔ اس زندگی کی کیفیت کا اندازہ مولانا کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے، فرماتے ہیں:

”ایک دن مجھے رات کو کھانا کھانے کے بعد اُنھوں نے جاتے ہوئے روک لیا، اور بہت ہی نرمی وملائمت سے جوان کے خاص محبت وشفقت کے وفور کا انداز ہوتا تھا، میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا: کیا بات ہے؟ کیوں تو گم صم رہتا ہے، اور کیوں ان خیالات میں پڑ گیا ہے؟ کھل کر کیوں نہیں کہتا؟ میں حسبِ عادت خاموش رہا۔ جب اُنھوں نے بہت اصرار کیا، تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے صرف اتنا ہی کہا کہ نہ میں گمراہ ہوں، نہ وہابی ہوگیا ہوں، نہ نیچری ہوں، نہ خاندان سے منحرف ہوں، جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے؛ البتہ بہت سی باتوں پر میرے دل کو اطمینان نہیں ہے اور جس سے اطمینان ملتا ہے، اس سے لیتا ہوں!

اُنھوں نے پوچھا: مثلاً کس سے؟ میں نے کہا: بہت سی باتیں سرسید کی کتابوں میں میرے دل کو لگیں اور میں انھیں پسند کرتا ہوں۔ آپ کی جانشینی کے لیے اور خاندانی منصب قائم رکھنے کے لیے بھائی موجود ہیں۔ مجھے لوگوں کے ہاتھ پاؤں چومنے اور پیر بنائے (جانے کے تصور) سے تکلیف ہوتی ہے۔ میں اپنے کو اس لائق نہیں سمجھتا اور میری التجا ہے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے!

بس اس پر پھر ان کی ناراضی شروع ہوگئی اور میں کچھ دیر سننے کے بعد خاموش چلا آیا۔ ناگہاں جاذبۂ توفیق الٰہی پردۂ عشق مجاز میں نمودار ہوا اور ہوش پرستی کی آوارگیوں نے خود بخود شاہراہِ عشق و محبت تک پہنچا دیا۔ آگ لگتی ہے تو رفتہ رفتہ شعلے بھڑکتے ہیں، سیلاب آتا ہے تو بتدریج پھیلتا ہے، یہ تو ایک بجلی تھی جو آناً فاناً نمودار ہوئی، چمکی اور دیکھا تو خاک کا ڈھیر تھا۔

می گزشتم ز غم آسودہ کہ ناگہ ز کمیں　　عالم آشوب نگاہے سر راہم بگرفت

میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں، میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں میں نہ گزر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیے ہیں اور تریاق کے نسخے بھی ہر دار الشفا کے آزمائے ہیں۔ میں جب پیاسا تھا تو میری لب تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں اور جب سیراب ہوا تو میری سیرابی کا چشمہ بھی شاہراہ عام پر نہ تھا۔

راہے کہ خضر داشت، ز سرچشمہ دور بود　　لبِ تشنگی ز راہِ دگر بردہ ایم ما!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس تمام عرصے کی جستجو و طلب کے بعد قرآن کو جیسا کچھ سمجھ سکا ہوں، میں نے ان تین کتابوں کے صفحوں پر پھیلا دیا ہے: ترجمان القرآن، البیان، مقدمہ تفسیر:

سبک زجائے نگیری، کہ بس گراں گہرست متاع من کہ نصیبش مباد ارزانی!

میرا یقین ہے کہ مسلمانوں کی زندگی و سعادت کے لیے سر چشمۂ حیات، حقیقتِ قرآنی کا انبعاث ہے اور میں نے کوشش کی ہے کہ اس کے فہم و بصیرت کا دروازہ ان پر کھل جائے۔ میں ترجمان القرآن شائع کرتے ہوئے محسوس کرتا ہوں کہ اس بارے میں جو کچھ میرا فرض تھا، توفیق الٰہی کی دستیابی سے میں نے ادا کر دیا۔ اب اس کے بعد جو کچھ ہے مسلمانوں کا فرض، اور یہ اللہ کے ہاتھ ہے کہ انھیں فرض ادا کرنے کی توفیق دے:

حدیث عشق و سرمستی زمن بشنو نہ از واعظ
کہ با جام و سبو ہر شب قرین ماہ و پروینم!

﴿مَا كَانَ حَدِيثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُونَ ﴿١١١﴾﴾

۱۶ر نومبر ۱۹۳۰ء... ڈسٹرکٹ جیل میرٹھ (ابوالکلام)

"اسی زمانے میں بمبئی کے سفر کا اتفاق ہوا۔ بمبئی پہنچتے ہی میں سخت بیمار ہو گیا۔ ایک نامعلوم درد کولھے کے پاس محسوس ہوتا تھا اور کوئی تشخیص نہیں ہو سکی تھی۔ آخر خود والد مرحوم نے تشخیص کیا کہ یہ وجع الورک ہے۔ اور کئی مہینوں کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوا۔ کامل دو ماہ تک چت لیٹا رہا تھا۔ اس بیماری کے زمانے میں والد مرحوم کا قلب اس درجے متاثر ہوا کہ وہ پچھلی ناراضگیاں بھول گئے۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک وہ حالات پیش نہ آئے، جو گھر میں پہلے روز پیش آتے تھے۔ تاہم میرے خیالات کا حال بدستور تھا۔"[1]

اس کے ساتھ ہی مولانا آزاد نے اپنے والد کے برتاؤ اور ان سے اپنے شخصی برتاؤ کے بارے میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ "والد مرحوم کے ساتھ معاملات کی جو عادت طفولیت سے پڑ چکی تھی، وہ اس وقت بھی چلتی رہی۔ ہم لوگ اُن کی کسی بات کے قطع کرنے یا جواب دینے یا رُو در رُو مقابلہ کرنے کے عادی

---

۱ ایضاً: ص ۳۹۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ تھے۔ وہ کتنے ہی غیظ و غضب میں زجر و ملامت کرتے، میں سن لیتا اور گردن جھکائے خاموش رہتا تھا۔" ایسے ماں باپ کے ساتھ اولاد کا یہی رویہ تھا اور یہی حضرت صاحبِ نبوت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم و تلقین تھی۔ مولانا آزاد نے اپنے والد کے ساتھ اسی برتاؤ کو ہمیشہ قائم رکھا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے جس استقامت کا ثبوت دے کر اپنے والدِ گرامی مولانا خیر الدین دہلوی کو مایوس کر دیا تھا۔ اُنھوں نے اپنے والد کے علم و مرتبے، عیش و عشرت کی زندگی کا کوئی اثر نہ لیا تھا اور نہ کسی محنت کے بغیر عزت و احترام اور شہرت کا لالچ اور تاریخ کے امثال سن کر متاثر ہوئے تھے۔ جب مولانا ابوالکلام کو محسوس ہوا کہ والد صاحب اُنھیں اپنا جانشیں بنا کر اپنے منصب پر لانا چاہتے ہیں، اس پر اُنھیں صاف کہہ دیا تھا کہ

"آپ کی جانشینی کے لیے اور خاندانی منصب قائم رکھنے کے لیے بھائی (مولوی غلام یاسین آہ) موجود ہیں۔ مجھے لوگوں کے ہاتھ پاؤں چومنے اور پیر بنانے سے تکلیف ہوتی ہے، میں اپنے کو اس لائق نہیں سمجھتا۔ میری التجا ہے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے!"[۱]

مولانا خیر الدین کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے بیٹے ابوالکلام فیروز بخت محی الدین احمد ہی کو اپنا جانشین بنانا چاہتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ اسے اپنے بڑے بیٹے سے زیادہ قابل اور ذہین سمجھتے تھے! لیکن اب چھوٹے بیٹے کو قابو میں آتے نہ دیکھ کر یہی مناسب سمجھا کہ بڑے بیٹے مولوی غلام یاسین ہی کو تربیت دیں اور اُنھی کو اپنا سجادہ نشیں بنا لیا جائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ والد مرحوم کا سامنا کرنے سے بہت گریز کرتے تھے۔ کلکتے میں وہ اپنا بیش تر وقت مطالعے اور تصنیف و تالیف میں گزارتے تھے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے کئی رسائل سے تعلق پیدا کر لیا تھا اور خود بھی رسالے نکالے تھے۔ 'الاصلاح' کے نام سے ایک علمی، ادبی اور سوشل ریفارم کا ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا۔ ہر ہفتے مختلف موضوعات پر جلسہ ہوتا تھا۔ دارالاخبار و ریڈنگ روم قائم کیا تھا جس میں اُردو، انگریزی، عربی اخبارات و رسائل کو رکھا جاتا تھا۔ کانفرنسوں میں شریک ہونے کا شوق تھا۔ ۱۹۰۵-۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت

---

۱ ایضاً: ص ۳۹۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام میں شریک ہوئے تھے اور نام پایا تھا اور شہرت دور دور پہنچ گئی تھی۔ علمی شوق اور وقت گزاری کے لیے اپنا ذاتی رسالہ 'لسان الصدق' کلکتہ میں نکالا تھا۔ اور مدت تک بمبئی میں رہ کر کلکتے کے پتے سے نکالتے رہے تھے۔ یہ رسالہ نومبر ۱۹۰۳ء سے جون ۱۹۰۵ء تک جاری رہا۔ وہ بند ہوا تو علامہ شبلی کے اصرار سے متاثر ہو کر ندوۃ العلما لکھنو کے رسالہ 'الندوہ' میں حضرت علامہ کی نیابت کی ذمہ داریوں کو انجام دیتے رہے۔ مولانا نے ستمبر ۱۹۰۵ء میں الندوہ کی ادارت میں شرکت فرمائی تھی اور مارچ ۱۹۰۶ء میں اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اور اسی سال کے وسط سے وکیل، امر تسر کی ادارت کو قبول کر لیا تھا۔

نومبر کے مہینے میں انھیں کلکتہ سے خبر ملی کہ ان کے بھائی ابو النصر مولوی غلام یاسین آہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ ان کے لیے بہت بڑا سانحہ تھا۔ آہ مرحوم گزشتہ سال اسلامی ممالک کی سیر کے لیے ایک واقف کے ساتھ وطن سے نکلے تھے اور ابھی عراق تک پہنچے تھے کہ بیمار پڑے۔ بیماری بڑھی تو انھیں ہسپتال میں داخل کر دیا۔ اس موقع پر نہایت افسوس ناک حادثہ پیش آیا کہ ان کے شریکِ سفر اور رہنما شخصیت اُنھیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کی حالت بہت بگڑ چکی تھی۔ کسی شخص نے ان کی حالت کی خبر انڈین سفارت خانے کو پہنچائی۔ خدا کا کرنا کہ سفارت خانے کے ایک انڈین آفیسر کو خبر ہوئی اور اس نے ان کو ہندوستان پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ ۱۹۰۶ء میں وہ بمبئی پہنچ گئے، ان کے والد نے کچھ دنوں تک بمبئی میں علاج کرایا، جب افاقہ نہ ہوا تو کلکتہ لے گئے۔ لیکن کلکتہ میں بھی ان کے معالجے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ان کا وقت پورا ہو چکا تھا، اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے انتقال کا ان کے والد گرامی اور بھائی کو بہت صدمہ ہوا۔ ان کا یہ صدمہ ان کے بیٹے کا ہی نہیں، ان کے سجادہ نشین کا بھی تھا۔

مولانا ابو الکلام آزاد کو نہ صرف بھائی کی اطلاع دی گئی تھی بلکہ انھیں کلکتہ پہنچنے کی تاکید کی گئی تھی۔ مولانا کے لیے بھی بھائی کے انتقال کا غم کسی سے کم نہ تھا۔ ان کے پہنچنے کے بعد نہ صرف والد نے بلکہ ان کے دوستوں نے بھی ان کے کلکتہ میں ٹھہر جانے پر اصرار کیا۔ اس پر ان کی بیوی کی رخصتی بھی کرا دی جو ۱۹۰۲ء میں ان کے عدمِ بلوغ کی وجہ سے عمل میں نہ آئی تھی۔ مولانا کی دو بہنوں کی شادی ہو گئی تھی اور وہ ریاست بھوپال میں آباد ہو گئی تھیں۔ بڑی بہن کا انتقال ہو گیا تھا۔ اب گھر میں آہ مرحوم کی بیوی اور مولانا آزاد کی نئی نویلی دلہن اور والدِ گرامی رہ گئے تھے۔

بیٹے کے انتقال کے بعد مولانا خیر الدین بہت شکستہ مزاج ہو گئے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ آزاد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ٹھہر جائیں۔ دوستوں نے ان کے لیے 'دارالسلطنت' کے نام سے ایک رسالے کے اجرا پر ایک رئیس کو آمادہ بھی کر دیا تھا اور مولانا نے کلکتہ میں ٹھہر جانے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ لیکن ایک مدت تک انتظار کے بعد مایوس ہو کر وہ امرتسر چلے گئے اور وکیل کی ادارت کو اختیار کر لیا۔ یہ واقعہ ۱۹۰۷ء کے وسط کا ہے۔

اب مولانا آزاد پر کلکتہ میں اپنی بیوی، بیوہ بھاوج اور والدِ گرامی کی ذمے داری تھی اور اسے عملاً پورا کرتے تھے۔ اگست ۱۹۰۸ء میں والد صاحب کی خرابیٔ صحت اور خطرے کی خبر آئی اور چند ہی دنوں میں ان کا فرستادہ بھی پہنچ گیا تو مولانا نے فرستادے کو تو روانہ کیا اور چند روز بعد خود بھی روانہ ہو گئے۔ ۱۵ر اگست کو وہ کلکتہ پہنچے۔ والد گرامی اپنی زندگی کے چند آخری لمحوں کے انتظار میں بے ہوش و حواس چارپائی پر پڑے ہوئے تھے۔ بیٹے نے قرآن پڑھنا شروع کیا تھا، مسافر نے اشارہ کیا اور خود پڑھنا شروع کیا۔ لیکن چند لمحوں ہی میں آواز بیٹھ گئی اور ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا ابو الکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی کو غلط راہ پر جانے سے محفوظ رکھا تھا اور راہِ حق کے قبول کی توفیق بخشی تھی اور زندگی بھر حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے نامور حفید شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلوی کی راہِ حقیقت پر، جو کتاب و سنت کی تعلیم کے مطابق تھی، اللہ جل جلالہ نے چلنے کی ہمت بخشی تھی۔ یہ اللہ کا ان پر بڑا احسان اور فیض تھا کہ وہ اس خطرے سے نکل آئے تھے۔

وہ ابھی ایک خطرے سے نکلے تھے کہ خداوند قدوس ان کے ایمان و مذہب کی صداقت کی آزمائش کے لیے ایک دوسری اور نہایت خطرناک آزمائش سے گزارتا اور اپنی مخلوق کے لیے اُن کی ذات کو اچھا نمونہ ثابت کرتا ہے۔ خاکسار کا اشارہ سر سید احمد خاں اور ابو الکلام کی طرف ہے جو ان کے افکار و عقائد کے مطالعے اور تقلید کے جال میں پھنس کر کسی مقام پر پہنچے اور قدرتِ الٰہی نے انھیں اپنی ملت اور مخلوق الٰہی کے لیے کس طرح ان کو اپنے عہد اور بعد کے زمانے کے لیے نمونہ ثابت کر دیا، یہ تمام تر موضوع مولانا ابو الکلام آزاد کے بیان اور ان کے قلم سے لکھی ہوئی داستان قارئین کے مطالعے کے لیے آئندہ پیش کی جائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

© rasailojaraid.com